ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 1918

Program: BS Islamic Studies

Semester: Autumn 2026

WhatsApp Orders: +92 324 5836626

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کورس :مطالعہ نصوص(1918)

سطح :بی ایس علوم اسلامیہ

سمسٹر :خزاں2026

امتحانی مشق نمبر 2 یونٹ نمبر 6 تا9

کل نمبر • 100 : کامیابی کے نمبر50 :

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

)مطالعہ و حوالہ کے لیے(

نوٹ :یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹوں کا مطالعہ کریں، مفاہیم کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں لکھیں۔

سوال نمبر :1 نام رکھنے سے متعلق نبوی تعلیمات اور اچھے برے ناموں کا معیار 20) نمبر(

سوال نمبر :1 کسی کا نام رکھنے سے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کیا ہیں؟ اسلامی نقطہ نظر سے اچھے اور برے ناموں کے معیار پر جامع نوٹ لکھیں۔

تعارف

نام انسان کی پہچان ہی نہیں ہوتا، اس کی شخصیت پر اثر انداز ہونے والا ایک مستقل تعارف بھی ہوتا ہے۔ بچہ زندگی بھر اسی نام سے پکارا جاتا ہے، اسی نام سے اس کے اعمال نامے سے تعلق جڑتا ہے اور قیامت کے دن بھی انسان اپنے اور اپنے والد کے نام کے ساتھ پکارا جائے گا، جیسا کہ احادیث میں آیا ہے۔ اسی اہمیت کی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

نے نام رکھنے کے باب میں تفصیلی رہنمائی عطا فرمائی، اچھے ناموں کی ترغیب دی، برے معنوں والے نام خود بدل کر دکھائے اور نام کے انتخاب کے اصول مقرر فرمائے۔ اس جواب میں نام رکھنے سے متعلق نبوی تعلیمات، اچھے اور برے ناموں کا معیار، نام بدلنے کی نبوی مثالیں اور موجودہ دور کے لیے اس موضوع کی اہمیت جامع انداز میں پیش کی جاتی ہے۔

نام رکھنے کی اہمیت اور نبوی ہدایات کی بنیاد

نام کے باب میں سب سے پہلی ہدایت یہ ہے کہ نام رکھنا بچے کا حق اور والدین کی ذمہ داری ہے۔ احادیث میں بچے کی پیدائش کے بعد اس کے سلسلے میں جو امور بیان ہوئے ہیں ان میں نام رکھنا، عقیقہ کرنا اور سر کے بال مونڈنا شامل ہیں، اور ساتویں دن کو ان کاموں کے لیے خاص کیا گیا ہے، البتہ پیدائش کے دن نام رکھنا بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، جیسے آپ نے بعض صحابہ کے بچوں کے نام پیدائش کے روز رکھے۔ دوسری بنیادی ہدایت یہ ہے کہ نام معنی کے لحاظ سے اچھا ہو، کیونکہ معنی ہی وہ چیز ہے جس کا اثر نام والے کی ذہنیت اور دوسروں کے تاثر پر پڑتا ہے۔ تیسری ہدایت یہ ہے کہ نام کے ذریعے شرک یا اللہ کے سوا کسی کی بندگی کا اظہار نہ ہو۔ چوتھی ہدایت یہ ہے کہ نام ایسا نہ ہو جس سے خود نام والا یا دوسرے بدشگونی لیں یا اس کا مذاق اڑایا جائے۔

سب سے پسندیدہ نام

صحیح مسلم کی روایت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے ناموں میں سب سے زیادہ پسندیدہ عبد اللہ اور عبد الرحمن ہیں۔ وجہ ظاہر ہے کہ ان ناموں میں اللہ کی بندگی کا اظہار بھی ہے اور اللہ کے دو عظیم ناموں کی طرف نسبت بھی۔ اسی طرح انبیاء کرام کے نام رکھنے کی ترغیب بھی حدیث میں آئی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صاحبزادے کا نام ابراہیم رکھا اور فرمایا کہ انبیاء کے ناموں پر نام رکھو۔ انبیاء کے ناموں میں محمد اور احمد کو سب سے بلند مقام حاصل ہے، کیونکہ یہ خود نبی آخر الزماں کے نام ہیں۔ اسی قبیل سے صالحین کے نام بھی پسندیدہ ہیں بشرطیکہ ان کے ساتھ غلو نہ کیا جائے۔ مسلم شریف کی ایک اور روایت میں حارث اور ہمام کو سچے نام قرار دیا گیا، حارث کے معنی کمانے اور کوشش کرنے والا اور ہمام کے معنی ارادہ کرنے والا ہیں، یعنی عملی زندگی کی طرف اشارہ کرنے والے نام اچھے ہیں۔

اچھے نام کا معیار

نبوی تعلیمات کی روشنی میں اچھے نام کے معیار کو چند نکات میں سمیٹا جا سکتا ہے۔ پہلا معیار مفہوم کی خوبی ہے: نام کا معنی پاکیزہ، مثبت اور خوش آئند ہو۔ دوسرا معیار اللہ کی بندگی کا اظہار ہے، جیسے عبد اللہ، عبد الرحمن اور عبد الرحیم۔ تیسرا معیار انبیاء و صالحین کی نسبت ہے، تاکہ بچے کے سامنے اچھا نمونہ رہے۔ چوتھا معیار تلفظ کی آسانی اور ماحول سے مناسبت ہے، تاکہ نام پکارنے میں دشواری اور طنز کا پہلو نہ ہو۔ پانچواں معیار یہ ہے کہ نام میں تکبر، خود پسندی یا برتری کا دعویٰ نہ ہو، کیونکہ حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک بدترین شخص وہ ہوگا جو ملك الاملاک نام رکھے، اس لیے کہ بادشاہت صرف اللہ کی ہے۔ چھٹا معیار یہ ہے کہ نام شرکیہ نسبتوں سے خالی ہو، مثلاً غیر اللہ کی بندگی ظاہر کرنے والے نام اہل علم کے نزدیک درست نہیں۔ ساتواں معیار اچھا شگون ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اچھے نام اور نیک فال کو پسند فرماتے تھے۔

مثالیں	خصوصیت	درجہ
عبد اللہ، عبد الرحمن	اللہ کی بندگی کا اظہار	سب سے پسندیدہ
محمد، ابراہیم، یوسف، حارث، ہمام	انبیاء و صالحین کے نام، اچھے معنی	پسندیدہ
حرب، مرہ، حزن کی قسم کے نام	بدشگونی، مایوسی یا جنگ و تلخی کا مفہوم	ناپسندیدہ
ملك الاملاک جیسے نام	اللہ سے خاص صفات کا دعویٰ یا شرکیہ نسبت	ممنوع

برے نام اور ان کا معیار

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن ناموں کو ناپسند فرمایا ان کی بنیاد دیکھنے سے برے نام کا معیار واضح ہو جاتا ہے۔ ابو داؤد کی روایت میں آپ نے فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک سب سے برے نام والوں میں وہ بھی ہوگا جس کا نام حرب یعنی جنگ ہو یا مرہ یعنی کڑوا ہو، کیونکہ یہ نام تلخی اور برائی کا مفہوم رکھتے ہیں۔ اسی طرح آپ نے ایسے ناموں سے بھی منع فرمایا جن میں تزکیہ نفس یعنی اپنی پاکیزگی کا دعویٰ ہو، آپ نے ایک بچی کا نام برہ، جس کے معنی نیکوکار

ہے، بدل کر زینب رکھا اور فرمایا کہ اپنے آپ کی پاکیزگی کا دعویٰ نہ کرو، اللہ بہتر جانتا ہے کہ تم میں نیک کون ہے۔ برے نام کی پہچان یہ ہے کہ اس کا معنی جنگ، تلخی، ناکامی، مایوسی، گناہ یا بداخلاقی پر دلالت کرے، یا اس میں خود ستائی ہو، یا وہ اللہ کی صفات خاص میں شرکت کا وہم پیدا کرے، یا اس سے بولنے سننے والے بدشگونی لیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام بدلنے کی مثالیں

یہ تعلیمات محض اصول نہیں رہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود عملاً کئی نام بدلے۔ عاصیہ نام کی خاتون کا نام بدل کر جمیلہ رکھا، کیونکہ عاصیہ کے معنی نافرمان کے ہیں۔ اصرم نامی شخص کا نام بدل کر زرعہ رکھا، جس کے معنی کھیتی اور نشو و نما کے ہیں۔ حزن نام کے معنی سختی اور دشواری کے ہیں۔ آپ نے ایک صحابی کو سہل نام تجویز کیا اگرچہ انہوں نے اپنے باپ کے رکھے ہوئے نام پر اصرار کیا، روایت بتاتی ہے کہ اس خاندان میں سختی باقی رہی؛ یہ واقعہ نام کے اثرات پر غور کی دعوت دیتا ہے۔ ابو الحکم کنیت والے شخص کی کنیت بدل کر اس کے بیٹے کے نام پر ابو شریح رکھی اور فرمایا کہ اصل حاکم اللہ ہے۔ ان مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نام بدلنے کا اصول یہ ہے کہ جب معنی برا ہو یا شرعی قباحت ہو تو تبدیلی پسندیدہ ہے، لیکن بلا وجہ نام بدلنا مقصود نہیں، اور بڑوں کا رکھا ہوا اچھا نام قائم رکھنا بھی ادب ہے۔

نام کے شخصیت اور معاشرے پر اثرات

جدید نفسیات بھی اس بات کی تائید کرتی ہے کہ نام انسان کی خود شناسی اور دوسروں کے پہلے تاثر کو متاثر کرتا ہے۔ اچھا نام بچے کو اعتماد دیتا ہے اور برے معنی یا مشکل تلفظ والا نام اسے مذاق کا نشانہ بنا سکتا ہے۔ اسلامی تعلیمات نے چودہ سو سال پہلے اسی حقیقت کی طرف رہنمائی کی۔ نام کا ایک روحانی پہلو بھی ہے کہ قیامت کے دن پکار نام ہی کے ذریعے ہوگی، اس لیے والدین کو چاہیے کہ وہ نام رکھتے وقت وقتی فیشن کے بجائے معنی، نسبت اور انجام دیکھیں۔ آج کل بعض والدین غیر زبانوں کے نام صرف آواز کی کشش پر رکھ لیتے ہیں جن کے معنی نامناسب نکلتے ہیں۔ ایسی صورت میں ایک اچھی عادت یہ ہے کہ نام رکھنے سے پہلے کسی مستند لغت یا اہل علم سے معنی کی تصدیق کر لی جائے۔ نام کے ساتھ کنیت اور لقب کا ادب بھی اسی باب کا حصہ ہے کہ اچھے لقب سے پکارا جائے اور برے القاب سے منع کیا گیا ہے، قرآن نے بھی تنابز بالالقاب سے روکا ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ نام رکھنے کے باب میں نبوی تعلیمات یہ ہیں کہ سب سے پسندیدہ نام عبد اللہ اور عبد الرحمن ہیں، انبیاء کے نام رکھنے کی ترغیب ہے، برے معنوں، بدشگونی، خود ستائی اور اللہ کی خاص صفات کے دعوے والے ناموں سے منع کیا گیا ہے اور ضرورت پڑنے پر برا نام بدلنا خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ اچھے نام کا معیار مفہوم کی پاکیزگی، بندگی الٰہی کا اظہار، صالح نسبت اور تلفظ کی آسانی ہے۔ جو والدین اس معیار کو اپنائیں گے وہ بچے کو ایک خوب صورت پہچان بھی دیں گے اور اس کی شخصیت کی نیک بنیاد بھی رکھیں گے۔

سوال نمبر :2 قرآن مجید کی حفاظت — حفظ، جمع و تدوین کے مراحل 20) نمبر(

سوال نمبر :2 قرآن مجید کی حفاظت کے لیے تاریخ اسلام میں کیا اقدامات کیے گئے؟ حفظ، جمع اور تدوین کے مراحل پر ایک تفصیلی جائزہ پیش کریں۔

تعارف

قرآن مجید وہ واحد آسمانی کتاب ہے جو اپنے نزول کے دن سے آج تک بغیر کسی تبدیلی کے محفوظ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود اس کی حفاظت کا وعدہ فرمایا : بے شک ہم نے ہی ذکر کو نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اس وعدے کی تکمیل اللہ نے اسباب کے ذریعے کی، جن میں سب سے پہلے خود مسلمانوں کے سینے، پھر کتابت، پھر جمع و تدوین کے منظم مراحل شامل ہیں۔ تاریخ اسلام میں حفاظت قرآن کے اقدامات تین بڑے عنوانات میں بیان ہوتے ہیں : زمانہ نبوی میں حفظ و کتابت، عہد صدیقی میں جمع اول، اور عہد عثمانی میں تدوین و اشاعت۔ اس جواب میں ان مراحل کا تفصیلی جائزہ اس انداز میں پیش کیا جاتا ہے کہ حفاظت کا الٰہی نظام اور انسانی اسباب دونوں واضح ہو جائیں۔

حفاظت کا الٰہی وعدہ اور اسباب کا نظام

یہ بات سمجھنا ضروری ہے کہ حفاظت قرآن اللہ کا وعدہ ہے، مگر اللہ کی سنت یہ ہے کہ وہ کام اسباب کے ذریعے کرواتا ہے۔ اس لیے قرآن کی حفاظت محض معجزانہ طور پر نہیں ہوئی بلکہ ایک مسلسل انسانی جدوجہد کے ذریعے بھی ہوئی،

جس میں ہزاروں صحابہ نے اپنی یادداشت، اپنے خون اور اپنی زندگیاں داؤ پر لگائیں۔ نزول کا تدریجی ہونا بذات خود حفاظت کا پہلا سبب تھا :قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے تقریباً تیئیس برس میں نازل ہوا، جس سے حفظ کرنا آسان ہوا۔ دوسرا سبب عربوں کی غیر معمولی قوت حافظہ تھی۔ تیسرا سبب یہ تھا کہ قرآن عبادت کا جز تھا، نماز میں تلاوت کی وجہ سے ہر مسلمان اس کا ایک حصہ یاد رکھنے پر مجبور و مشتاق تھا۔ چوتھا سبب سالانہ دور کا اہتمام تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر رمضان جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ قرآن کا دور فرماتے اور آخری سال دو مرتبہ دور ہوا۔

عہد نبوی میں حفظ و کتابت

عہد نبوی میں حفاظت کا پہلا ذریعہ حفظ تھا۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے حافظ قرآن تھے اور صحابہ میں سینکڑوں حفاظ موجود تھے، جنگ یمامہ میں ستر قاریوں کی شہادت اس بات کی دلیل ہے کہ حفاظ کی بڑی تعداد موجود تھی۔ اصحاب صفہ اور مسجد نبوی تعلیم قرآن کا مرکز تھے۔ دوسرا ذریعہ کتابت تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کاتبین وحی مقرر کیے تھے جن میں حضرت زید بن ثابت، حضرت ابی بن کعب، حضرت معاویہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔ جب کوئی آیت نازل ہوتی تو آپ کاتب کو بلا کر لکھواتے اور اس کی جگہ بھی ارشاد فرماتے کہ اسے فلاں سورت میں فلاں آیات کے پاس رکھو۔ لکھنے کے لیے اس زمانے کے میسر مواد، یعنی پتھر کی تختیاں، چمڑے کے ٹکڑے، کھجور کی شاخیں اور ہڈیاں استعمال ہوتیں۔ تیسرا ذریعہ عمل و تبلیغ تھا، صحابہ قرآن کو سنتے ہی زندگی میں نافذ کرتے اور اسے دوسروں تک پہنچاتے، چنانچہ قرآن تحریر کے ساتھ تواتر عملی سے بھی محفوظ رہا۔

عہد صدیقی میں جمع قرآن

حفاظت کا دوسرا بڑا مرحلہ عہد صدیقی میں آیا۔ 12 ہجری میں جنگ یمامہ میں ستر حفاظ کی شہادت پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا کہ قرآن کو ایک جگہ جمع کیا جائے تاکہ حفاظ کی شہادت سے قرآن کا کوئی حصہ ضائع ہونے کا خدشہ نہ رہے۔ حضرت ابو بکر ابتدا میں تردد میں رہے کہ وہ کام کیسے کریں جو رسول اللہ نے نہیں کیا، پھر اللہ نے ان کا سینہ کھول دیا اور حضرت زید بن ثابت کو اس عظیم ذمہ داری پر مقرر کیا گیا۔ حضرت زید جوان، عاقل، کاتب وحی اور حافظ قرآن تھے۔ انہوں نے سخت احتیاط کا طریقہ اختیار کیا :صرف اپنے حفظ پر اکتفا نہیں کیا، نہ کسی لکھی ہوئی چیز کو بغیر گواہی قبول کیا، ہر آیت کے لیے دو عادل گواہ طلب کیے کہ یہ

رسول اللہ کے سامنے لکھی گئی تھی۔ اس طرح قرآن ایک مصحف کی صورت میں مکمل جمع ہو گیا۔ یہ صحیفے حضرت ابو بکر کے پاس رہے، ان کے بعد حضرت عمر کے پاس، اور ان کے بعد حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس محفوظ رہے۔

عہد عثمانی میں تدوین و توحید قراءت

تیسرا مرحلہ عہد عثمانی میں پیش آیا۔ جب اسلام دور دراز علاقوں میں پھیلا تو مختلف خطوں کے لوگ مختلف قراءتوں میں تلاوت کرنے لگے اور آرمینیہ و آذربائیجان کے غزوے کے موقع پر حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے یہ اختلاف دیکھ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خبردار کیا کہ اس سے پہلے کہ امت کتاب اللہ میں اختلاف کا شکار ہو اس کا تدارک کیا جائے۔ حضرت عثمان نے حضرت حفصہ سے اصل صحیفے منگوائے اور ایک لجنہ مقرر کیا جس کے سربراہ حضرت زید بن ثابت تھے اور اس میں قریش کے تین فصحاء بھی شامل تھے، ہدایت یہ تھی کہ اختلاف کی صورت میں قریش کی زبان کو ترجیح دی جائے کیونکہ قرآن اسی میں نازل ہوا تھا۔ لجنہ نے صحیفوں سے متعدد مصاحف تیار کیے جو خطے کے بڑے شہروں، یعنی مکہ، شام، کوفہ، بصرہ اور مدینہ، میں بھیجے گئے اور ان کے ساتھ قاری بھی مقرر کیے گئے۔ اصل صحیفے حضرت حفصہ کو واپس کر دیے گئے۔ اسی تدوین کی وجہ سے حضرت عثمان کو جامع القرآن کہا جاتا ہے۔ امت کے تمام خطوں میں ایک ہی رسم الخط پر اتفاق ہو گیا اور اختلاف کی جڑ کٹ گئی۔

کلیدی اقدام	دور	مرحلہ
حفاظ کی بڑی جماعت، کاتبین وحی، رمضان میں دور قرآن	عہد نبوی (23 سال)	حفظ و کتابت
زید بن ثابت کی نگرانی میں دو گواہوں کی شرط کے ساتھ ایک مصحف	عہد صدیقی (12–13 ہجری)	جمع اول
لجنہ کے ذریعے متعدد سرکاری مصاحف کی تیاری و ترسیل	عہد عثمانی (تقریباً 25 ہجری)	تدوین و اشاعت
ابو الاسود الدؤلی وغیرہ کی خدمات، طباعت کے دور میں یکسانیت	بعد کے ادوار	تنقیط و اعراب

بعد کے ادوار میں اضافی اقدامات

مصاحف عثمانی ابتدا میں نقطوں اور اعراب سے خالی تھے، عربوں کے لیے یہ کافی تھا، لیکن عجمی مسلمانوں کی کثرت کے بعد تلاوت کی آسانی کے لیے نقطے اور اعراب کا نظام آہستہ آہستہ شامل ہوا جس میں ابو الاسود الدؤلی اور ان کے شاگردوں کی خدمات مشہور ہیں۔ خلیل بن احمد الفراہیدی نے موجودہ اعرابی علامات کو منظم کیا۔ پھر خطاطی کے فن نے قرآن کی کتابت کو جمال بخشا، بڑے بڑے کاتبوں نے خوب صورت نسخے تیار کیے۔ پرنٹنگ کے دور میں سرکاری نگرانی میں مصاحف چھاپے گئے اور آج سعودی عرب کے مجمع ملک فہد جیسے ادارے دنیا بھر میں معیاری مصاحف اور تراجم شائع کر رہے ہیں۔ ہر دور میں حفاظ کی مسلسل زنجیر بھی جاری رہی؛ آج بھی دنیا میں لاکھوں حفاظ موجود ہیں اور تجوید کی اسناد کا نظام اسی حفاظت کی کڑی ہے۔ اگر کسی نسخے میں طباعت کی غلطی آ بھی جائے تو حفاظ کی زندہ روایت فوراً اس کی نشاندہی کر دیتی ہے، یہ حفاظت کی انفرادیت ہے جو کسی اور کتاب کو حاصل نہیں۔

حفاظت قرآن کی انفرادیت کا جائزہ

اس تفصیلی جائزے سے چند نتائج نکلتے ہیں۔ پہلا یہ کہ حفاظت قرآن کسی ایک فرد یا ایک دور کی کوشش کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک اجتماعی، مسلسل اور کثیر جہتی نظام ہے جس میں سینے، قلم، حکومت اور امت سب شریک رہے۔ دوسرا یہ کہ ہر مرحلے پر احتیاط کا معیار انتہائی سخت رکھا گیا، گواہیوں کی شرط اس کی روشن مثال ہے۔ تیسرا یہ کہ حفاظت کا اصل سرمایہ تواتر ہے یعنی ہر نسل نے قرآن کو اگلی نسل سے اس قدر کثرت کے ساتھ نقل کیا کہ اس میں تبدیلی کا تصور ہی ناممکن ہو گیا۔ چوتھا یہ کہ قرآن کا رسم الخط، اس کی قراءتیں اور اس کے معانی سب محفوظ روایتوں کے ذریعے منتقل ہوئے۔ مستشرقین کے بڑے بڑے محققین بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ قرآن کا متن جس صورت میں آج موجود ہے وہی صورت نزول کے دور کی ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی حفاظت کے لیے عہد نبوی میں حفظ و کتابت اور سالانہ دور کا نظام قائم ہوا، عہد صدیقی میں حضرت زید بن ثابت کی قیادت میں سخت شرائط کے ساتھ قرآن ایک مصحف میں جمع کیا گیا، اور عہد عثمانی میں سرکاری لجنہ کے ذریعے اس کی تدوین کر کے مصاحف بڑے شہروں میں بھیج دیے گئے۔ بعد کے ادوار میں نقطے،

اعراب، خطاطی، طباعت اور حفاظ کی مسلسل روایت نے اس نظام کو مکمل کیا۔ یہی وہ اسباب ہیں جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا حفاظت کا وعدہ تاریخ میں ظاہر ہوا اور قرآن آج بھی اسی صورت میں ہمارے ہاتھوں میں ہے جس صورت میں وہ نازل ہوا تھا۔

سوال نمبر :3 نماز کی شرائط — فقہ اسلامی کی روشنی میں وضاحت 20) نمبر(

سوال نمبر :3 نماز کے صحیح ہونے کے لیے کتنی چیزوں کا پایا جانا ضروری ہے؟ فقہ اسلامی کی روشنی میں ان شرائط کی وضاحت کیجئے۔

تعارف

نماز دین کا ستون اور بندے و رب کے درمیان سب سے مضبوط تعلق ہے۔ نماز کے درست اور مقبول ہونے کے لیے شریعت نے کچھ شرائط مقرر کی ہیں جن کے بغیر نماز شرعاً صحیح نہیں ہوتی۔ فقہاء ان شرائط کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ یہاں یہ نکتہ پہلے سمجھ لینا چاہیے کہ گنتی کا اختلاف جزوی ہے :اگر طہارت کی تین صورتوں، یعنی بدن، لباس اور جگہ کی پاکی، کو الگ الگ گنا جائے تو شرائط صحت سات بنتی ہیں، اور اگر طہارت کو ایک شرط مانا جائے تو یہ ابواب کی صورت میں مختصر ہو جاتی ہیں۔ مقصود گنتی کی بحث نہیں بلکہ ان تمام امور کا بیان ہے جن کا پایا جانا نماز کی صحت کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اس جواب میں شرائط کا مفہوم، پھر ایک ایک شرط کی وضاحت، شرائط وجوب سے فرق اور عملی رہنمائی پیش کی جاتی ہے۔ یہ مطالعاتی بیان ہے، کسی مخصوص عملی مسئلے میں مستند اہل علم سے رجوع مناسب ہے۔

شرط کا مفہوم اور شرائط کی اقسام

اصول فقہ کی اصطلاح میں شرط وہ چیز ہے جس کے نہ ہونے سے مشروط کا نہ ہونا لازم آئے، لیکن اس کے ہونے سے مشروط کا ہونا لازم نہ آئے۔ سادہ الفاظ میں نماز کی شرائط وہ امور ہیں جن میں سے کوئی ایک بھی مفقود ہو تو نماز صحیح نہیں ہوتی۔ فقہاء نے شرائط کو دو بڑی قسموں میں تقسیم کیا ہے :شرائط وجوب، جن کا تعلق اس بات سے ہے کہ نماز کس پر فرض ہے، جیسے مسلمان ہونا، عاقل ہونا اور بالغ ہونا؛ اور شرائط صحت، جن کا تعلق نماز کی درستی

سے ہے، جیسے طہارت، ستر اور قبلہ رخ ہونا۔ سوال کا تعلق دوسری قسم سے ہے۔ نماز کے ارکان، یعنی قیام، قراءت، رکوع اور سجود، سے شرائط اس لیے الگ ہیں کہ ارکان نماز کے اندر ہوتے ہیں اور شرائط نماز سے پہلے اور اس کے ساتھ مطلوب ہوتی ہیں۔ اس فرق کو سمجھنے سے طالب علم کو نماز کے فقہی نقشے کی واضح صورت مل جاتی ہے۔

پہلی شرط :بدن کی پاکی

شرائط میں پہلی شرط بدن کا پاک ہونا ہے۔ اس کے دو پہلو ہیں :حدث اصغر سے پاک ہونا یعنی وضو کا ہونا، اور حدث اکبر سے پاک ہونا یعنی جنابت کی صورت میں غسل کرنا؛ اور دوسرا پہلو بدن سے ظاہری نجاست کا زائل ہونا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ اللہ توبہ کرنے والوں اور پاکی اختیار کرنے والوں کو پسند کرتا ہے، اور حدیث میں طہارت کو نصف ایمان کہا گیا ہے۔ اگر نمازی بے وضو ہو یا اس کے بدن پر ایسی نجاست ہو جس کا زوال ممکن ہو اور مقدار معافی سے زیادہ ہو، تو اس کی نماز درست نہیں ہوگی۔ عورت کے لیے حیض و نفاس سے پاک ہونا بھی اسی شرط میں آتا ہے۔ اس شرط کی حکمت یہ ہے کہ بندہ اللہ کے حضور پاکیزہ حالت میں حاضر ہو، کیونکہ ظاہری پاکی باطنی توجہ کی بنیاد بنتی ہے۔

دوسری اور تیسری شرط :لباس اور جگہ کی پاکی

دوسری شرط لباس کا پاک ہونا ہے۔ سورۃ المدثر میں ارشاد ہوا کہ اپنے کپڑوں کو پاک رکھو۔ جس لباس میں نماز پڑھی جا رہی ہو اس کا نجاست سے پاک ہونا شرط ہے، اسی طرح ٹوپی، پگڑی اور جائے نماز اگر لباس کے حکم میں ہوں تو ان کی پاکی کا بھی لحاظ رکھا جائے گا۔ تیسری شرط نماز کی جگہ کا پاک ہونا ہے، یعنی جہاں نمازی کھڑا ہو، جہاں سجدہ کرے اور جہاں اس کے اعضاء لگیں وہ جگہ پاک ہو۔ یہ شرط اس لیے رکھی گئی کہ سجدہ عظمت الٰہی کے سامنے پیشانی رکھنے کا عمل ہے، ناپاک جگہ پر یہ ادا اس کی شان کے خلاف ہے۔ سفری حالات یا تنگی کی صورتوں میں فقہاء نے پاک حصے کو استعمال کرنے کی گنجائشیں بیان کی ہیں، مگر اصل اصول یہی ہے کہ جگہ کی پاکی کا اہتمام کیا جائے۔

چوتھی شرط :ستر عورت

چوتھی شرط ستر پوشی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے :اے آدم کی اولاد !ہر نماز کے وقت اپنی زینت یعنی لباس اختیار کرو۔ مرد کا ستر ناف سے گھٹنوں تک ہے اور عورت کا ستر اس کے تمام جسم کو شامل ہے سوائے چہرے، ہاتھوں اور قدموں کے،

مختلف مکاتب فکر کی جزوی تفصیلات کے ساتھ۔ نماز کے دوران اگر ستر کا بڑا حصہ اتنی دیر کھلا رہے جتنی دیر میں ایک رکن ادا ہو سکتا ہے تو فقہاء کے ہاں نماز فاسد ہو جائے گی۔ اس شرط کی حکمت حیا کا تحفظ اور نماز کی وقار آمیز فضا کا قیام ہے۔ اسی لیے گھر میں تنہا نماز پڑھتے ہوئے بھی ستر کا اہتمام ضروری ہے، کیونکہ نماز میں حاضر اصل میں اللہ کے حضور ہوا جاتا ہے۔

پانچویں شرط :قبلہ رخ ہونا

پانچویں شرط استقبال قبلہ ہے، یعنی نماز میں خانہ کعبہ کی طرف رخ کرنا۔ سورۃ البقرہ میں صریح حکم ہے کہ اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر لو اور جہاں کہیں بھی ہو اپنے چہرے اسی کی طرف کر لو۔ جو شخص کعبہ کو دیکھ رہا ہو اس کے لیے عین کعبہ کی طرف رخ کرنا ہے اور جو دور ہو اس کے لیے جہت قبلہ کافی ہے۔ سفر میں قبلے کی جستجو کے اصول بھی فقہاء نے بیان کیے ہیں :تحقیق کی کوشش کی جائے، کوئی بتانے والا نہ ہو تو اپنے ظن غالب پر عمل کیا جائے۔ قبلہ امت کی وحدت کی عظیم علامت ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان ایک ہی مرکز کی طرف رخ کر کے کھڑے ہوتے ہیں۔ بیمار یا سوار شخص کے لیے اس شرط میں شرعی آسانیاں موجود ہیں جن کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں درج ہے۔

چھٹی شرط :وقت کا پایا جانا

چھٹی شرط نماز کا وقت داخل ہونا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ بے شک نماز مومنوں پر مقررہ اوقات میں فرض کی گئی ہے۔ ہر نماز کا وقت مقرر ہے :فجر طلوع فجر سے طلوع آفتاب تک، ظہر زوال کے بعد سے، عصر اس کے بعد، مغرب غروب آفتاب کے بعد اور عشاء شفق کے غائب ہونے کے بعد۔ وقت سے پہلے پڑھی گئی نماز ادا نہیں ہوتی، چاہے نماز کے سارے ارکان درست ہوں۔ اس شرط کی حکمت زندگی میں نظم و ضبط اور اللہ کے حکم کی پابندی ہے۔ فقہاء نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ اگر کسی کو بھول جائے یا نیند آ جائے تو جب یاد آئے یا جاگے اسی وقت نماز پڑھے، یہی اس کا وقت ہے، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔ وقت کی شرط طالب علم کو یہ سبق بھی دیتی ہے کہ عبادت اللہ کے مقرر کردہ پروگرام کے تابع ہے، اپنی سہولت کے تابع نہیں۔

ساتویں شرط :نیت

ساتویں شرط نیت ہے، یعنی دل میں اس نماز کا ارادہ کرنا جس کو پڑھا جا رہا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔ نیت دل کے ارادے کا نام ہے، زبان سے کہنا ضروری نہیں، البتہ بعض اہل علم نے زبان سے ادائیگی کو دل کی توجہ جمع کرنے کے لیے بہتر کہا ہے۔ فرض نمازوں میں نماز کا تعین بھی نیت میں ضروری ہے، جیسے ظہر یا عصر کی نماز، اور امام و مقتدی کے لیے اقتدا کی نیت بھی اسی سے متعلق ہے۔ نیت کی حکمت یہ ہے کہ عبادت عادت سے الگ ہو جائے :کھڑا ہونا ایک ہی عمل ہے مگر نیت اسے کبھی فرض، کبھی سنت اور کبھی نفل بناتی ہے۔ نیت کے بغیر حرکت محض جسمانی مشق رہ جاتی ہے، عبادت نہیں بنتی۔

شرط	مختصر مفہوم	دلیل کی بنیاد
بدن کی پاکی	وضو یا غسل، نجاست سے پاکی	طہارت نصف ایمان — حدیث
لباس کی پاکی	نماز کا لباس نجاست سے پاک ہو	سورۃ المدثر4 :
جگہ کی پاکی	قیام و سجود کی جگہ پاک ہو	فقہی اجماعی اصول و سجدے کی تعظیم
ستر عورت	مقررہ حدود میں بدن ڈھانپنا	سورۃ الاعراف31 :
استقبال قبلہ	کعبہ کی طرف رخ کرنا	سورۃ البقرہ144 :
وقت	نماز اپنے مقررہ وقت میں ہو	سورۃ النساء103 :
نیت	دل میں نماز کا تعین و ارادہ	انما الاعمال بالنیات — حدیث

شرائط کی عدم موجودگی کا اثر اور عملی رہنمائی

ان شرائط میں سے کسی ایک کے مفقود ہونے سے نماز شرعاً صحیح شمار نہیں ہوتی اور اس کا اعادہ لازم آتا ہے۔ یہ سختی نہیں بلکہ عبادت کی حفاظت ہے، کیونکہ یہی شرائط نماز کو بے ترتیبی سے بچاتی ہیں۔ عملی طور پر مسلمان کو نماز سے پہلے ایک مختصر تیاری کی عادت بنانی چاہیے :وضو کی تجدید یا اس کا اطمینان، لباس اور جگہ کی جھلک، وقت کی تصدیق، قبلے کی سمت اور دل میں نیت۔ نماز میں بار بار ہونے والی غلطیوں کی بڑی وجہ اسی تیاری کی کوتاہی ہوتی ہے۔ یہ بات بھی نوٹ کرنی چاہیے کہ وسوسوں کا علاج علم ہے :شرائط کا صحیح علم انسان کو اطمینان دیتا ہے اور افراط و

تفریط دونوں سے بچاتا ہے۔ جزوی فقہی مسائل، مثلاً شک کی صورت یا معذوری کی حالت، میں اپنے مکتب فکر کے مستند اہل علم سے رہنمائی لینا ہی درست روش ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ نماز کی صحت کے لیے بدن، لباس اور جگہ کی پاکی، ستر عورت، استقبال قبلہ، وقت اور نیت کا پایا جانا ضروری ہے؛ یہی وہ سات امور ہیں جنہیں فقہ اسلامی میں شرائط صحت نماز کہا جاتا ہے۔ ان شرائط کے دلائل قرآن و حدیث میں موجود ہیں اور ان کی حکمتیں پاکیزگی، حیا، وحدت، نظم و ضبط اور اخلاص کی صورت میں ظاہر ہیں۔ جو نمازی ان شرائط کا اہتمام کرتا ہے اس کی نماز نہ صرف فقہی اعتبار سے درست ہوتی ہے بلکہ اس میں حضور قلب کی بنیاد بھی فراہم ہو جاتی ہے۔

سوال نمبر :4 حفظ اللسان اور امام غزالی کی بیان کردہ صدق کی اقسام 20) نمبر(

سوال نمبر :4 حفظ اللسان) زبان کی حفاظت (کے لغوی معنی واضح کریں، نیز امام غزالی کی بیان کردہ صدق)سچائی (کی اقسام کی وضاحت کریں۔

تعارف

زبان اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں سے ہے۔ اسی سے انسان اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے، علم سیکھتا اور سکھاتا ہے، اللہ کا ذکر کرتا ہے، مگر یہی زبان اگر بے لگام ہو جائے تو جھوٹ، غیبت، چغلی اور بہتان جیسی تباہ کاریوں کا دروازہ بن جاتی ہے۔ قرآن و حدیث میں زبان کی حفاظت پر بہت زور دیا گیا ہے اور صوفیہ و اخلاقیات کے اماموں نے اس موضوع کو اپنی کتابوں کے بڑے ابواب کا عنوان بنایا ہے۔ امام غزالی نے احیاء علوم الدین میں زبان کی آفات پر مفصل باب لکھا اور صدق کو اخلاق کی بلند ترین منزلوں میں شمار کرتے ہوئے اس کی اقسام بیان کی ہیں۔ اس جواب میں پہلے حفظ اللسان کے لغوی و اصطلاحی معنی، پھر اس کی اہمیت، اور اس کے بعد امام غزالی کی بیان کردہ صدق کی چھ اقسام کی وضاحت پیش کی جاتی ہے۔

حفظ اللسان کے لغوی معنی

حفظ اللسان دو لفظوں کا مرکب ہے۔ حفظ کے لغوی معنی ہیں کسی چیز کی نگہبانی کرنا، اسے ضائع ہونے اور خراب ہونے سے بچانا اور اس کی حفاظت کے لیے چوکنا رہنا۔ اسی مادے سے حافظ اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی امانت کی پوری حفاظت کرتا ہے، خواہ وہ قرآن کی یادداشت ہو یا کسی مال و راز کی نگہبانی۔ اللسان کے معنی زبان کے ہیں اور عربی محاورے میں لسان سے مراد کلام اور گفتگو بھی لی جاتی ہے، کیونکہ گفتگو کا آلہ زبان ہی ہے۔ اس طرح حفظ اللسان کے لغوی معنی ہوئے زبان کی نگہبانی کرنا، اسے بے عمل اور بے فائدہ استعمال سے روکنا اور اس کی حفاظت اس طرح کرنا کہ اس سے کوئی ایسی بات نہ نکلے جو خود بولنے والے یا دوسروں کے لیے نقصان دہ ہو۔ لغوی مفہوم ہی میں ایک خوب صورت اشارہ موجود ہے کہ زبان ایک امانت ہے جس کی حفاظت کی جائے گی، یہ کوئی ایسی چیز نہیں جسے بے پروائی کے ساتھ استعمال کیا جائے۔

حفظ اللسان کا اصطلاحی مفہوم اور اس کی اہمیت

اصطلاح شرع میں حفظ اللسان سے مراد ہے زبان کو ہر اس بات سے بچانا جو شریعت میں ناپسندیدہ یا حرام ہو، جیسے جھوٹ، غیبت، چغلی، بہتان، گالی، فحش گوئی، مذاق میں جھوٹ اور بے فائدہ فضول گفتگو، اور زبان کو ان باتوں میں استعمال کرنا جو پسندیدہ ہیں، جیسے ذکر الٰہی، تلاوت، نرمی سے گفتگو، صلح کرانا اور علم کی بات۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص مجھے دو چیزوں، زبان اور شرمگاہ، کی ضمانت دے میں اسے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔ ایک اور حدیث میں فرمایا کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ بندہ اللہ کی رضا کی بات کہتا ہے اور اسے معمولی سمجھتا ہے مگر اللہ اس کے سبب اس کے درجات بلند کر دیتا ہے، اور بندہ اللہ کی ناراضی کی بات یوں ہی کہہ دیتا ہے جس سے وہ جہنم کی گہرائی میں گرتا ہے۔ قرآن میں قول سدید یعنی سیدھی اور سچی بات کہنے کا حکم ہے اور مومنوں کی صفت بتائی گئی ہے کہ وہ لغو سے اعراض کرتے ہیں۔

امام غزالی اور ان کا منہج

امام محمد غزالی رحمہ اللہ پانچویں صدی ہجری کے عظیم عالم اور احیاء علوم الدین کے مصنف ہیں۔ انہوں نے اخلاقی تربیت کو محض معلومات کے بجائے قلب کی اصلاح کا عمل قرار دیا۔ زبان کے باب میں ان کا منہج یہ ہے کہ پہلے زبان کی آفات گنوائی جائیں تاکہ انسان خطرے کو پہچانے، پھر ان کے علاج اور متبادل نیک استعمال کی طرف رہنمائی کی جائے۔ صدق کے باب میں بھی ان کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے صدق کو صرف زبان کی سچائی تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے انسان کے پورے وجود، نیت، عزم، عمل اور باطنی مقامات، تک پھیلا دیا۔ اسی وسعت کی بنا پر غزالی کی بیان کردہ اقسام کو سمجھنا ضروری ہے، کیونکہ اکثر لوگ صدق کے بارے میں یہ سمجھتے ہیں کہ زبان سے جھوٹ نہ بولا جائے، حالانکہ یہ صدق کا پہلا اور سب سے نچلا درجہ ہے۔

صدق کی پہلی اور دوسری قسم :زبان اور نیت کا صدق

امام غزالی کے بیان میں صدق کی پہلی قسم زبان کا صدق ہے، یعنی خبر دینے میں سچ بولنا، بات واقعے کے مطابق کہنا اور جھوٹ سے کامل پرہیز کرنا۔ اس درجے میں وعدے کی سچائی بھی داخل ہے کہ جو وعدہ کرے اسے پورا کرنے کی نیت رکھے۔ بچوں، خرید و فروخت اور روزمرہ گفتگو میں اسی درجے کے صدق کی زیادہ آزمائش ہوتی ہے۔ دوسری قسم نیت اور ارادے کا صدق ہے، یعنی انسان کے اعمال کا محرک صرف اللہ کی رضا ہو، دکھاوا، شہرت اور دنیاوی فائدہ اس کی نیت کو مکدر نہ کرے۔ زبان کا صدق پھر بھی ظاہر کی چیز ہے، مگر نیت کا صدق باطن کی بنیاد ہے؛ جس کی نیت سچی ہو اس کی زبان خود بخود سنور جاتی ہے۔ اس درجے کی پہچان یہ ہے کہ انسان تنہائی اور مجمع میں ایک جیسا عمل کرتا ہے۔ اخلاص اسی صدق کا دوسرا نام ہے۔

صدق کی تیسری اور چوتھی قسم :عزم اور وفائے عزم کا صدق

تیسری قسم عزم میں صدق ہے۔ انسان بعض اوقات نیکی کا پختہ ارادہ کرتا ہے، مثلاً کہتا ہے کہ اگر اللہ مجھے مال دے تو میں اس کی راہ میں خرچ کروں گا، یا صحت دے تو عبادت میں کوتاہی نہیں کروں گا۔ اگر یہ ارادہ دل کی گہرائی سے ہو اور اس میں تردد نہ ہو تو یہ سچا عزم ہے، اور اگر محض وقتی جوش ہو تو یہ عزم کا جھوٹ ہے جو آگے چل کر بے وفائی بن جاتا ہے۔ قرآن نے ان لوگوں کا بھی ذکر کیا جنہوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ فضل ملے تو صدقہ کریں گے، مگر

ملنے پر بخل کیا، اور اسے نفاق کی علامت قرار دیا گیا۔ چوتھی قسم عزم کی وفا میں صدق ہے، یعنی جس نیک ارادے کا عزم کیا تھا اسے عملاً پورا کرنا۔ نفس کے لیے عزم کرنا آسان اور اس پر قائم رہنا مشکل ہوتا ہے، اس لیے وفائے عزم کا درجہ عزم سے بلند ہے۔ اس درجے کی مثال اصحاب رسول کی زندگیوں میں ملتی ہے کہ جنہوں نے مشکل ترین حالات میں بھی اپنے عہد نبھائے۔ گویا تیسرا درجہ وعدے کی سچائی ہے اور چوتھا وعدہ نبھانے کی سچائی۔

صدق کی پانچویں اور چھٹی قسم :عمل اور مقامات کا صدق

پانچویں قسم عمل میں صدق ہے، یعنی انسان کے ظاہری اعمال اس کے باطن کی عکاسی کریں :نماز میں ظاہر کی حاضری کے ساتھ دل بھی حاضر ہو، زہد کا اظہار زبان سے نہ ہو بلکہ زندگی میں بھی قناعت نظر آئے۔ جس کا ظاہر باطن سے مختلف ہو وہ عمل کے صدق سے محروم ہے۔ چھٹی اور بلند ترین قسم مقامات دین میں صدق ہے، یعنی خوف، امید، محبت، توکل، رضا اور زہد جیسے باطنی مقامات کے دعوے میں سچا ہونا۔ مثلاً جو شخص اللہ سے ڈرنے کا دعویٰ کرتا ہے مگر گناہوں سے نہیں بچتا، اس کا خوف کا دعویٰ سچا نہیں۔ جو توکل کا مدعی ہے مگر اسباب کی ہلکی سی کمی پر گھبرا جاتا ہے، اس کا توکل نامکمل ہے۔ یہ درجہ صدیقین کا مقام ہے اور یہی وجہ ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو صدیق کا لقب ملا کہ ان کا ایمان، قول، عمل اور باطن سب صدق کی تصویر تھے۔ غزالی فرماتے ہیں کہ جس میں یہ چھ اقسام مکمل ہو جائیں وہی حقیقی معنوں میں صادق اور صدیق ہے۔

پہچان	قسم صدق	درجہ
خبر اور وعدے میں سچائی، جھوٹ سے پرہیز	زبان کا صدق	1
عمل صرف اللہ کی رضا کے لیے، ریا سے خالی	نیت کا صدق	2
نیکی کا پختہ، غیر متردد ارادہ	عزم کا صدق	3
کیے ہوئے عزم کو عملاً پورا کرنا	وفائے عزم کا صدق	4
ظاہر و باطن کی ہم آہنگی	عمل کا صدق	5

خوف، توکل، محبت و رضا کے دعوے کی حقیقت	مقامات کا صدق	6

حفظ اللسان اور صدق کا باہمی تعلق اور عملی تدابیر

حفظ اللسان اور صدق کا تعلق بنیاد اور عمارت کا ہے :صدق زبان کی حفاظت کا مثبت پہلو ہے اور حفظ اللسان اس کا حفاظتی پہلو۔ عملی تدابیر میں پہلی تدبیر خاموشی کی عادت ہے، حدیث میں ہے کہ جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے وہ بھلائی کی بات کہے یا خاموش رہے۔ دوسری تدبیر بولنے سے پہلے سوچنا ہے کہ بات سچی ہے، ضروری ہے اور اس کا انداز نرم ہے یا نہیں۔ تیسری تدبیر مجالس کا انتخاب ہے، ایسی مجلسوں سے دور رہنا جہاں غیبت اور فضول گوئی معمول ہو۔ چوتھی تدبیر زبان کو نیک مشغلوں میں لگانا ہے :ذکر، تلاوت اور علمی گفتگو زبان کو بے کار باتوں سے خود بخود بچاتی ہے۔ پانچی تدبیر محاسبہ ہے کہ سوتے وقت انسان دن بھر کی گفتگو کا جائزہ لے اور لغزش پر توبہ کرے۔ امام غزالی کی سیرت و تعلیمات کا حاصل یہی ہے کہ زبان کا سدھرنا دل کے سدھرنے کی علامت ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ حفظ اللسان کے لغوی معنی زبان کی نگہبانی اور اسے نقصان دہ استعمال سے بچانے کے ہیں، اور اصطلاحاً زبان کو جھوٹ، غیبت اور فضول کلام سے بچا کر ذکر و خیر میں استعمال کرنا مراد ہے۔ امام غزالی نے صدق کی چھ اقسام بیان کی ہیں :زبان کا صدق، نیت کا صدق، عزم کا صدق، وفائے عزم کا صدق، عمل کا صدق اور مقامات دین کا صدق۔ یہ ترتیب انسان کو سچائی کے سفر میں قدم قدم آگے بڑھاتی ہے حتیٰ کہ وہ صدیقیت کے مقام کی طرف بڑھتا ہے۔ جو طالب علم ان اقسام کو سمجھ کر اپنی گفتگو اور نیت کی اصلاح کرے وہی اس سوال کا اصل فائدہ حاصل کرے گا۔

سوال نمبر :5 مومن اور مسلمان کا فرق — احادیث کی روشنی میں 20) نمبر(

سوال نمبر :5 احادیثِ نبویہ کی روشنی میں مومن اور مسلمان کے درمیان کیا فرق بیان کیا گیا ہے؟ اس فرق کی شرعی بنیادوں کو واضح کیجئے۔

تعارف

اسلام اور ایمان دو ایسے بنیادی الفاظ ہیں جو قرآن و حدیث میں کبھی ایک ہی مفہوم میں اور کبھی الگ الگ مفاہیم کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔ یہ فرق سمجھنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے، کیونکہ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کا ظاہری ڈھانچہ کیا ہے، اس کی روح کیا ہے اور کامل مسلمان بننے کا سفر کس طرح طے ہوتا ہے۔ سورۃ الحجرات میں دیہاتیوں کے اس دعوے پر کہ ہم ایمان لائے، ہدایت دی گئی کہ یوں کہو کہ ہم اسلام لائے، کیونکہ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ اس آیت اور احادیث نبویہ کی روشنی میں علماء نے اسلام و ایمان کے تعلق کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ اس جواب میں لفظی مفہوم، حدیث جبرئیل کی روشنی میں تعریفات، دیگر احادیث کے اشارے، فرق کی شرعی بنیادیں اور اس فرق کے عملی نتائج پیش کیے جاتے ہیں۔

اسلام اور ایمان کے لغوی مفاہیم

اسلام کا لفظی معنی ہے سر تسلیم خم کرنا، فرمانبردار ہو جانا اور اپنے آپ کو سپرد کر دینا۔ شرعی گفتگو میں اس کا ظاہری پہلو نمایاں ہے، یعنی اللہ کے احکام کے آگے ظاہری اطاعت اختیار کرنا۔ ایمان کا لفظ امن سے ہے جس کے معنی ہیں تصدیق کرنا، دل سے مان لینا اور اس طرح مطمئن ہو جانا کہ شک و تردد ختم ہو جائے۔ اسی لیے ایمان کا تعلق قلب سے ہے۔ لغت کا یہ فرق آگے چل کر شرعی فرق کی بنیاد بنتا ہے :اسلام کا مرکز ظاہر ہے اور ایمان کا مرکز باطن۔ البتہ یہ بات یاد رہے کہ لغوی فرق کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ظاہر اور باطن ایک دوسرے سے کٹے ہوئے ہیں، اصل دین دونوں کا مجموعہ ہے؛ یہ فرق درجہ و مرکز کا ہے، علیحدگی کا نہیں۔ اسی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ ہر مومن مسلمان ضرور ہے، لیکن ہر مسلمان کا کامل ایمان کے درجے پر ہونا لازم نہیں آتا۔

حدیث جبرئیل میں اسلام و ایمان کی تعریف

اس فرق کی سب سے روشن دلیل مشہور حدیث جبرئیل ہے جو صحیح مسلم میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ جبرئیل علیہ السلام انسانی صورت میں حاضر ہوئے اور اسلام کے بارے میں پوچھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ ظاہری ارکان بیان فرمائے :اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں، نماز قائم کرنا، زکاۃ دینا، حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔ پھر ایمان کے بارے میں پوچھا تو آپ نے چھ باطنی عقائد بیان فرمائے :اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، آخرت کے دن پر اور تقدیر کی بھلائی و برائی پر ایمان لانا۔ اس ایک حدیث سے واضح ہو گیا کہ جب اسلام و ایمان جدا جدا ذکر ہوں تو اسلام سے مراد ظاہری اعمال کا نظام ہوتا ہے اور ایمان سے مراد قلبی عقائد کا نظام۔ اور پھر احسان کا درجہ ان دونوں کی روح ہے کہ اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو۔

دیگر احادیث میں فرق کے اشارے

کئی احادیث میں مسلمان اور مومن کی تعریف عملی صفات کے ذریعے الگ الگ کی گئی ہے۔ ایک حدیث میں فرمایا گیا کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں، اور مومن وہ ہے جس سے لوگ اپنی جانوں اور مالوں کے بارے میں امن میں رہیں۔ یہاں مسلمان کی تعریف ظاہری نقصان نہ پہنچانے سے اور مومن کی تعریف اعتماد و امانت کے بلند مقام سے کی گئی ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے واقعے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو مال غنیمت سے حصہ نہ دیا اور حضرت سعد کے بار بار عرض کرنے پر کہ وہ مومن ہے، آپ نے فرمایا کہ یوں کہو وہ مسلم ہے۔ اس واقعے سے علماء نے یہ اصول اخذ کیا ہے کہ کسی کے باطن یعنی ایمان کا قطعی دعویٰ احتیاط سے کرنا چاہیے، کیونکہ دلوں کا حال اللہ جانتا ہے، ہم ظاہر پر حکم لگاتے ہیں۔ اسی طرح حدیث میں منافق کی علامتیں بتا کر خبردار کیا گیا ہے کہ ظاہری اسلام کے ساتھ اگر جھوٹ، وعدہ خلافی اور خیانت موجود ہو تو ایمان کا تقاضا پورا نہیں ہوتا۔

اجتماع و افتراق کا اصولی قاعدہ

علماء نے اس پوری بحث کو ایک مشہور قاعدے میں سمیٹ دیا ہے :جب اسلام و ایمان الگ الگ ذکر ہوں تو دونوں کا مفہوم ایک ہوتا ہے، یعنی پورا دین مراد ہوتا ہے، اور جب دونوں ایک ساتھ ذکر ہوں تو ان کے مفاہیم الگ ہو جاتے ہیں، اسلام ظاہر کے لیے اور ایمان باطن کے لیے۔ قرآن میں بہت سی جگہ مؤمنین سے خطاب پورے دین کے معنوں میں ہوا ہے اور مسلمین کا لفظ بھی کبھی امت کی مکمل پہچان کے طور پر آیا ہے، جیسے فرمایا گیا کہ تمہارا نام اس نے مسلمان رکھا ہے۔ اس قاعدے کے سمجھنے سے آیات و احادیث کے بظاہر اختلاف کا حل نکل آتا ہے اور طالب علم کسی ایک لفظ کو بنیاد بنا کر غلط نتائج نکالنے سے بچ جاتا ہے۔ اسی طرح علماء یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ اس فرق کا مطلب یہ نہیں کہ ظاہری اعمال کی اہمیت کم ہے، فرق درجے اور ترتیب کا ہے :اسلام داخلہ ہے، ایمان اس کی گہرائی ہے اور احسان اس کی معراج۔

فرق کی شرعی بنیادیں

اس فرق کی شرعی بنیادوں کو چند نکات میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ پہلی بنیاد قرآنی آیت حجرات 14 ہے جس میں اسلام اور ایمان کو ایک ہی سیاق میں الگ الگ استعمال کر کے بتایا گیا کہ ظاہری اطاعت کا دعویٰ قلبی تصدیق کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ دوسری بنیاد حدیث جبرئیل ہے جس میں دونوں کی تعریفیں متعین کر دی گئیں۔ تیسری بنیاد انسانی زندگی کا مشاہدہ ہے کہ ظاہر و باطن میں فرق ممکن ہے، منافق اسی کی مثال ہے جو زبان سے اسلام کا دعویٰ کرتا ہے مگر دل ایمان سے خالی ہوتا ہے۔ چوتھی بنیاد احکام کا عملی نظام ہے :دنیاوی احکام، یعنی نکاح، وراثت، نماز جنازہ اور دفن، ظاہری اسلام پر چلائے جاتے ہیں کیونکہ انسانوں کے پاس ظاہر ہی کا پیمانہ ہے، جبکہ اخروی نجات کا مدار ایمان و اخلاص پر ہے۔ پانچی بنیاد درجات کا نظام ہے :ایمان میں کمی بیشی ہوتی ہے، اعمال سے بڑھتا ہے اور نافرمانی سے گھٹتا ہے، جبکہ اسلام کا دائرہ دعوے و اطاعت کے ساتھ قائم رہتا ہے۔ یہ بنیادیں اس فرق کو ایک لفظی بحث نہیں رہنے دیتیں بلکہ اسے پورا نظام زندگی بنا دیتی ہیں۔

پہلو	اسلام / مسلم	ایمان / مومن
مرکز	ظاہری اطاعت و عمل	قلبی تصدیق و یقین

اللہ، فرشتے، کتب، رسل، آخرت، تقدیر	شہادت، نماز، زکاۃ، حج، روزہ	حدیث جبرئیل میں
باطن اللہ کے علم میں	ظاہری اسلام پر	دنیاوی احکام کا مدار
کامل ایمان نفاق کی نفی کرتا ہے	ظاہری دعوے کے باوجود باطنی خلا ممکن	امکان نفاق
داخلے کی گہرائی و کمال، آگے احسان	دین میں داخلہ	درجہ

اس فرق کے عملی نتائج اور فوائد

اس فرق کو سمجھنے کے کئی عملی فوائد ہیں۔ پہلا فائدہ خود احتسابی ہے :انسان صرف ظاہری اعمال پر مطمئن ہونے کے بجائے اپنے ایمان کی کیفیت کا بھی جائزہ لیتا ہے۔ دوسرا فائدہ دوسروں کے بارے میں حسن ظن اور احتیاط ہے :کسی کے باطن پر قطعی حکم لگانا ہمارا کام نہیں، اللہ دلوں کا مالک ہے۔ تیسرا فائدہ معاشرتی امن ہے :ظاہری اسلام رکھنے والے کے حقوق محفوظ رہتے ہیں اور تکفیر کی جلد بازی کا دروازہ بند ہوتا ہے۔ چوتھا فائدہ تربیت کی درست ترتیب ہے :بچوں اور نئے مسلمانوں کو پہلے ارکان و اعمال سکھائے جاتے ہیں، پھر عقیدے کی گہرائی اور اخلاص کی طرف لے جایا جاتا ہے۔ پانچواں فائدہ یہ ہے کہ انسان اسلام کی ظاہری شناخت پر فخر کے بجائے ایمان کے کمال کی جستجو میں رہتا ہے، کیونکہ قرآن نے کرامت کا معیار تقویٰ قرار دیا ہے نسب و دعویٰ نہیں۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ احادیث کی روشنی میں اسلام اور ایمان کے درمیان فرق ظاہر و باطن، عمل و عقیدے اور داخلے و کمال کا فرق ہے۔ حدیث جبرئیل نے اسلام کو ظاہری ارکان اور ایمان کو قلبی عقائد سے تعبیر کیا، سورۃ الحجرات کی آیت نے اسی فرق کی قرآنی بنیاد فراہم کی اور دیگر احادیث نے اس کے عملی پہلو واضح کیے۔ شرعی بنیاد یہ اصول ہے کہ اکٹھے ذکر ہوں تو دونوں کے معنی الگ ہوتے ہیں اور الگ ذکر ہوں تو پورا دین مراد ہوتا ہے۔ مومن کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ اسلام کے ظاہری نظام کو ایمان کی باطنی روشنی اور احسان کی کیفیت سے مکمل کرے، یہی دین کی مکمل صورت ہے۔